This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

RAHAT-UL-QULOOB

Bi-Annual, Trilingual (Arabic, English, Urdu) ISSN: (P) 2025-5021. (E) 2521-2869

Project of **RAHATULQULOOB RESEARCH ACADEMY,**

Jamiat road, Khiljiabad, near Pak-Turk School, link Spini road, Quetta, Pakistan.

Website: www.rahatulquloob.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: » Australian Islamic Library, IRI (AIOU), Tahqeeqat, Asian Research Index, Crossref, Euro pub, MIAR, ISI, SIS.

TOPIC

فلسفہ جبر وقدر کی قرآنی حیثیت

Concept of Destiny and free will in the light of the Holy Qura'an

AUTHORS

1. *Dr. Muhammad Hanif, Associate Professor, NIPS, QAU, Islamabad.*
   Email: hanifkhalil@gmail.com
   orcid id: https://orcid.org/0000-0002-1100-8572
2. *Dr. Javed Iqbal, Assistant Professor, Department of Pashto, UOB, Quetta.*
   Email: Javediqbalk71@gmail.com
   orcid id: https://orcid.org/0000-0001-7273-9267

How to Cite: Dr. Muhammad Hanif, and Dr. Javed Iqbal. 2021. "URDU: فلسفہ جبر وقدر کی قرآنی حیثیت: Concept of Destiny and Free Will in the Light of the Holy Qura'an". *Rahatulquloob* 5 (1), 73-86. https://doi.org/10.51411/rahat.5.1.2021/340.

URL: http://rahatulquloob.com/index.php/rahat/article/view/340

Vol. 5, No.1 || January–June 2021 ||URDU- P. 73-86

Published online: 17-01-2021

QR. Code

فلسفہ جبر وقدر کی قرآنی حیثیت

Concept of Destiny and free will in the light of the Holy Qura'an

[1]محمد حنیف، [2]جاوید اقبال

ABSTRACT:
The concept of fate luck and destiny, the philosophy of Jabr-O-Qadar in other words the philosophy of destiny remained very significant and to some extent a controversial subject of debate among the muslim thinkers, writers and philosophers in particular and it remained a hot subject of discussion among the world intelligentsia as a general as well. A number of schools of thought along with individual scholars approached that particular subject with their own specific ideas and interpretations by presenting their logic, evidences and explanations having the fact that all referred the Holly Quran as a fundamental source of inspiration. It has also been explained that to what extent the humanity may depend on its free will and despite of the Almighty Allah's decision of destiny for the human being. What a person can do with his free will in this world and what he can't do. What is the real status of luck and fate and what is the true sprits of the concept of destiny in the context of Quranic verses and to what extent the various Islamic schools of thought represent the true Quranic spirits. To explain and elaborate all these concepts the Quranic verses have been given and analyzed in this paper.
Keywords: Jabr-O-Qadar, Destiny and free will, philosophers, Qura'anic spirits.

فلسفہ ءجبر وقدر اسلامی تاریخ کے تناظر میں بنو امیہ کے دور سے زیر بحث رہا ہے اور مختلف مکاتیب فکر سے وابستہ علماء کے نقطہ ہائے نظر میں عموماً اختلافات سامنے آئے ہیں۔ اگر چہ اکثر و بیشتر علماء و فلاسفہ کا بنیادی ماخذ قرآن حکیم ہی رہا مگر پھر بھی مختلف و متضاد نظریات و تشریحات ان کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان علماء و فلاسفہ میں زیادہ شہرت معتزلہ مکتب فکر کے موئدین کو حاصل ہوئی جن کے ساتھ کئی دانشوروں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے علماء، مفسرین اور دانشوروں میں سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور غلام احمد پرویز کی تشریحات دیگر علماء و مفسرین سے جدا اور منفرد انداز کی رہیں جن میں عقلی استدلال کا عنصر زیادہ نمایاں رہا۔ اس لئے اس بحث میں مذکورہ دانشوروں کے نقطہ ہائے نظر کو خصوصی طور پر پیش نظر رکھا جائے گا مگر ساتھ ہی قرآن حکیم کو ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے براہ راست بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر چہ یہ مسئلہ محض اسلامی مفکرین و منورین کے پیش نظر نہیں رہا بلکہ اقوام عالم، مذاہب عالم اور دنیا کے دیگر فلاسفہ نے بھی نظریہ تقدیر، قضاو قدر، جبر و اختیار اور فلسفہ ءجبر و قدر کے زیر عنوان ان مباحث میں حصہ لیا ہے۔ یوں ان اختلافات کے تناظر میں دو مختلف الخیال مکاتیب فکر سامنے آئے ہیں۔

فلسفہ ءجبر و قدر یا تقدیر الہیہ کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھنے سے پہلے قرآنی تصور کو بھی سامنے لانا ہو گا اور ساتھ ہی اُن اختلافات کا بھی جائزہ لینا ہو گا جو بطور خاص مسلم فلاسفہ کے افکار میں پائے جاتے ہیں۔ خصوصی طور پر ایسی صورت حال میں کہ دونوں مختلف الخیال دانشوروں کا بنیادی ماخذ ایک ہی ہے، یعنی قرآن حکیم۔ اختلاف بنیادی طور پر یہ ہے کہ دانشوروں کا ایک گروہ اس رائے کا موئد ہے کہ خالق

حقیقی نے انسان کی زندگی میں پیش آنے والے تمام افعال کو پہلے سے اُس کی سرشت میں لکھا ہے اور یوں خالق در حقیقت مختار کل ہے، انسان کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ اسی کو انسان کا تقدیر کہتے ہیں جو قسمت، مقدر اور نصیب کے اصطلاحات سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے، خالق نے اُس کی تقدیر میں اپنی مرضی سے سب کچھ نہیں لکھا بلکہ انسان ہی کو آزادی دی ہے کہ وہ اس دنیا میں جیسے چاہے اپنی مرضی کی زندگی گذارے باالفاظ دیگر وہ خود ہی اپنی تقدیر بناتا ہے اور لکھواتا ہے۔ ان مختلف الخیال فلاسفہ و دانشوروں کے درمیان ایک گروہ ایسا بھی ہے جو انسان کو کسی حد تک مجبور اور کسی حد تک صاحب اختیار و ارادہ سمجھتے ہیں اور جہاں وہ مجبور ہے وہاں اُس کی تقدیر خدا نے لکھی ہے جہاں وہ اپنی مرضی کا مالک ہے وہاں وہ تقدیر کے اس تصور سے آزاد ہے۔

جب ہم قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں بصراحت بیان کر دیا گیا ہے کہ خالق حقیقی کس کس مقام پر اختیار و ارادہ کو اپنے پاس رکھتا ہے اور کس کس موقع پر انسان کو صاحب اختیار و ارداہ بناتا ہے۔ یہ بالکل وواضح ہے مگر ہمارے دانشور طبقہ اور مختلف مکاتیب فکر کے ترجمان مفسرین نے اس مسئلے کو بلاضرورت لاینحل بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ تقدیر کی توضیح و تفسیر اور قضا و قدر کے اصطلاحات نے بھی کئی غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں تقدیر یا قدر کا ذکر آیا ہے تو ہمارے اکثر علماء اور مفسرین نے اُسے انسان کے نوشتۂ تقدیر سے تعبیر کیا ہے اور یہ تصور پیش کیا ہے کہ دُنیا میں سب کچھ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی سے کرتا ہے حتیٰ کہ تمام انسانی اعمال وافعال بھی انسانوں سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق سرزد ہوتے ہیں۔ حالانکہ تقدیر و قدر کا یہ تصور پیش کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قانون اور اسلامی اصول و نظام متزلزل ہو جاتا ہے۔

قرآن حکیم میں نصیب کا لفظ بھی آیا ہے جس کو ہمارا دانشور طبقہ قسمت کے اُس تصور سے تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی قسمتیں پہلے سے لکھ دی ہیں۔ سب کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم سر سید احمد خان کے نقطہ نظر کو بھی سامنے رکھیں گے لیکن پہلے محمد عمران الدین کے الفاظ میں مذکورہ دو مختلف الخیال مکاتیب کا تذکرہ اسلامی تاریخ کے تناظر میں کریں گے جس کا لب لباب یہ ہے: ''جبر و قدر کا مسئلہ اسلامی فلسفے میں خاص اہمیت کا مالک رہا ہے۔ اس کی ابتداایوں ہوئی کے بنو امیہ کے زمانے میں جب ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا تو بعض بادشاہ اور ان کے ہوا خواہ اپنے ظلموں کا جواز تلاش کرنے کے لئے عقیدہ جبر کی آڑ لیتے تھے۔ یعنی ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں مجبور ہیں۔ خدا ہم سے یہ افعال کروا رہا ہے۔ اس عقیدے کی جنہوں نے تائید کی وہ جبریہ کہلائے۔ بعد کو صوفیوں نے بھی اس عقیدے کو اختیار کر لیا اس لئے کہ عقیدۂ وحدت الوجود سے اس کا قریبی تعلق تھا۔ رفتہ رفتہ عام مسلمانوں پر بھی اس عقیدے نے اثر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے عملی اور زندگی سے فرار کی ذہنیت عام ہونے لگی۔ اس گروہ کے مقابل اور اس عقیدے کا جواب دینے کے لئے بنو امیہ کے زمانے ہی میں ایک فرقہ پیدا ہوا جو قدریہ یا عدلیہ کہلایا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ خدنے قرآن میں سزا و جزا کا وعدہ کیا ہے اور خدا عادل بھی ہے' اس لیے اگر انسان کو اپنے فعل اور ارادے کا مختار نہ مانا جائے تو خدا پر ظلم کا الزام آئے گا کہ وہ مجبوروں کو ان کے فعل کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ آگے چل کر معتزلہ نے اس عقیدے کو اپنایا۔ چنانچہ انسان کا اپنے ارادے میں مکمل بااختیار ہونا ان کے بنیادی عقائد میں سے ہے''۔[1]

نامور دانشور، ادیب و فلسفی اور اسلامی علوم کے ماہر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر فلسفہ جبر و قدر کو قرآنی تناظر میں بیان کرتے ہوئے قریب قریب سید احمد خان کے موقف کی تائید کرتے ہیں اور اپنے موقف کی تائید نصِ قرآنی سے کرتے ہوئے یوں وضاحت کرتے ہیں۔ ربّ رحمن نے اپنے فضل و کرم سے انسان کو رُشد و گمراہی اور تقوی و فجور کے موضوعی معیار سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، قُرآن حکیم نے اس حقیقت کے موضوعی پہلو سے بھی ہمیں آشنا کر دیا ہے کہ اللہ سُبحانہ و تعالی نے انسان کا امتحان لینے کی خاطر اس کے نفس میں رُشد و ضلالت اور تقوی و فجور کی مثبت و منفی خواہشات و میلانات فطرۃً ودیعت کر دیئے ہیں اور ان کی حسین و قبیح نتائج و عواقب سے بھی اُسے فطرۃً مطلع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب انسان کے اختیارات میں سے ہے کہ وہ اپنے لیے سعادت و کامیابی کا فطری و حسین راستہ منتخب اختیار کرتا ہے یا گمراہی وناکامی کا قبیح و غیر فطری راستہ۔ علاوہ برین، اگر وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا رہتا ہے یعنی اس کی تطہیر کے ذریعے اسے نشو نما دیتا رہتا ہے تو وہ فوز و فلاح پاتا ہے، یعنی اس دنیا میں نفسِ مطمئنہؔ بن کر حیات طیبہؔ گزارتا ہے اور آخرت میں جنت اس کا حسن المآب ہو گا۔ بخلاف اس کے، اگر وہ اپنے نفس کو قبیح خواہشات و جذبات اور کفر و شرک اور جرم و گناہ کے بار گراں تلے دبا دیتا ہے تو وہ اُسے برباد کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ رہین خود و حُزن اور اہل نار ہو جاتا ہے اور آخرت میں جہنم اس کا شرّ مآب ہو گا۔ یہ فلسفہ تقدیر و آرزو ہے جیسے قُرآن عظیم نے اپنے ایجاز بلاغت سے اس طرح بیان کیا ہے۔ فلسفہ جبر و قدر کے اس تصور کے موئیدین مسلم فلاسفہ و دانشوروں میں چند دیگر بھی ہیں جن میں غلام احمد پرویز نے اپنی تحریروں میں جابجا وضاحت کی ہے مگر اس نقطۂ نظر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز اور چند دیگر اس فکر کے دانشوروں کو متنازعہ بھی بنایا گیا ہے لہذا اس تصور کے موئیدین میں غیر متنازعہ دانشوروں میں حضرت علامہ اقبال کا نام لیا جا سکتاہے جنھوں نے نہ صرف اپنے خطبات میں بلکہ اپنی شاعری میں بھی کئی بار فلسفہ جبر و قدر کو اسی تناظر میں پیش کیا ہے جس کے تحت انسان کو با اختیار بتایا گیا ہے نہ کہ مجبور محض۔ یہاں تک کے اقبال تقدیر و جبر کے پابند صرف نباتات و جمادات کو سمجھتے ہیں۔ صاحب عقل و ارادہ انسان کو آزاد اور خود مختار سمجھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات

مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند[2]

بات بالکل واضح ہے کہ مومن انسان محض اللہ تعالیٰ کے احکام کے عین مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے کیونکہ وہ صاحب عقل و خرد ہے۔ نباتات و جمادات چونکہ صاحب عقل و شعور نہیں لہذا اُن کے تقادیر اللہ تعالیٰ نے خود متعین کی ہیں۔ یہ تصور، تقدیر کے جبری نظریات کے حامل علماء کو کسی طور قابل قبول نہیں اور وہ دلیل میں قرآنی آیات بھی پیش کرتے ہیں جن سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم و اِذن سے ہوتا ہے وہ جو چاہتا ہے، جیسے چاہتا ہے، کرتا ہے۔ اس کے تصورِ آزادیٔ فکر و عمل کو قرآن حکیم سے ہم آہنگ دکھانے کے لئے ضروری ہے کہ ان جبری عقائد والے علماء کے دلائل اور اُن کے پیش کردہ قرآنی آیات پر بھی غور کیا جائے تاکہ واضح ہو جائے کہ واقعی ان آیات کا مطلب یہی ہے جو جبری عقائد کے حامل علماء پیش کرتے ہیں۔ اس سے بھی پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ قرآنی آیات میں تو (معاذاللہ) کسی قسم کا تخالف و تضاد ہو نہیں سکتا لہذا ان پیش کردہ آیات پر ہی غور کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے [3]

"سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پہلے لکھا ہے اور وہ جب چاہے، جیسے چاہے کرتا ہے"۔ اس جبری تصور کے لئے درج ذیل آیات کا عموماً حوالہ دیا جاتا ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشاء وَ يَهدِيْ مَنْ يَّشَآءُ [4]

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا [5]۔

ترجمہ: کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ [6]۔

ترجمہ: کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اِذن سے آتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ [7]۔

ترجمہ: ایسے لوگ اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے۔

قرآنی آیات اور ان کا ترجمہ ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن سے لیا گیا ہے۔ اسے دوسرے تفاسیر سے متقابل کر کے بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ ان آیات کے ظاہری مفاہیم سے تو یہی تصور سامنے آتا ہے کہ اللہ اپنی مرضی سے جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہے بھٹکاتا ہے۔ انسانوں پر جو بھی مصائب و آلام آتے ہیں یہ پہلے سے لکھا گیا ہے اور یہ مصائب اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے آتے ہیں اور لوگ اپنے نوشتۂ تقدیر ہی کے مطابق اپنا حصہ پاتے ہیں۔ گویا انسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس تصور کو ہمارے دانشور طبقہ اور علماء کرام نے تقدیر سے تعبیر کیا ہے۔ مگر ان پیش کردہ آیات کے شانِ نزول کے علاوہ اگر ان ہی آیات کے آگے اور پچھلے آیات بھی دیکھی جائیں تو بات کھل جاتی ہے کہ ان آیات کا مفہوم وہ نہیں جو جبری عقائد رکھنے والے علماء عموماً پیش کرتے ہیں۔ پہلے پیش کردہ آیت مبارکہ کا ابتدائی حصہ یہ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ [8]

ترجمہ: ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔

اب اس آیت مبارکہ کے دونوں حصوں کو ملا کر پڑھنے سے واضح تصور سامنے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی حجت کے محض اپنی مرضی سے کسی کو بھٹکاتا بھی نہیں اور ہدایت بھی نہیں دیتا۔ بھٹکانے اور ہدایت دینے سے پہلے لوگوں کو اُن ہی کی زبان میں اور اُس قوم میں سے رسول بھیجتا ہے اور کھول کھول کر بات سمجھاتا ہے۔ پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اُنہیں بھٹکاتا ہے اور جو لوگ

اُس پیغام کو اپناتے ہیں اُنہیں اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے۔ بات بالکل واضح ہے کہ انسانوں کا گمراہ ہونا اور ہدایت پانا اُن کی اپنی چاہت کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر کہا ہے کہ وہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ہدایت ملتا ہے تو صرف اُن کو جو حق کو قبول کرلے۔ سورۃ الصف میں موسیٰؑ اور اُس کی قوم کے حوالے سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب موسیٰؑ اللہ تعالیٰ کا پیغام اور حق لے آئے اور قوم نے اُسے قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اُن فاسق اور بھٹکے لوگوں کو ہدایت نہیں دی کیونکہ وہ فاسقوں کو ہدایت دیتا ہی نہیں یہی اللہ کا قانون ہے اور یہی قاعدہ سورۃ الصف میں آیا ہے کہ:

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ط فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ[9]۔

ترجمہ: اور یاد کرو موسیٰ کی وہ بات جو اُس نے اپنی قوم سے کہی تھی کہ "اے میری قوم کے لوگو تم کیوں مجھے اذیت دیتے ہو۔ حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں" پھر جب انہوں نے ٹیڑھ ودو اختیار کی تو اللہ نے اُن کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

دوسرے اور تیسرے نمبر پر جو آیات درج کی ہیں وہ تمام سورۃ الحدید میں آئی ہیں۔ ان آیات کا پس منظر و پیش منظر بھی پڑھنا ضروری ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ مصائب و آلام کس طرح خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ ان آیات میں واضح کیا گیا ہے کہ مصیبتوں کا اللہ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے آنا بلا کسی حجت و ضرورت کے نہیں بلکہ اس میں بھی انسانوں کے اپنے اعمال و افعال کا دخل ہے اور یہاں بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے رسول پہلے سے واضح نشانات اور ہدایات لے کر آتے ہیں مگر پھر بھی جب لوگ انکار کرتے ہیں، کفر کرتے ہیں، تکبر کرتے ہیں، بخل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات و ہدایت کو رد کرتے ہیں تو پھر اُن لوگوں پر مصیبتیں آجاتی ہیں۔ سورۃ الحدید کے متعلقہ حصے کا صرف ترجمہ پیش ہے جس سے اِن آیات کا پس منظر و پیش منظر واضح ہو جائے گا۔ دوسرے نمبر پر دیئے گئے آیت مبارکہ کے بعد آیا ہے۔

"ایسا کرنا اللہ کیلئے بہت آسان کام ہے (یہ سب کچھ اس لئے کہ) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمہیں ہو اس پر تم دِل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھُول نہ جاؤ۔ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔ جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کرنے پر اُکساتے ہیں۔ اب اگر کوئی روگردانی کرتا ہے تو اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہو اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے اللہ اُس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اسے ایسے جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخ کے باشندے ہوں گے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔"[10]

ان آیات کے بعد وہ آیت ہے جو تیسرے نمبر پر درج کیا گیا ہے۔ اب اگر ان مذکورہ آیات میں درمیان کے کئی آیات کو چھوڑ کر

پہلا اور آخری حصہ الگ الگ پڑھیں گے تو یہی تصور سامنے آئے گا کہ تمام مصائب و آلام اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی سے آتے ہیں لیکن جب درمیان کی تمام آیات کو مِلا کر تسلسل سے پڑھیں گے تو بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مصائب صرف اُن پر آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلاتے ہیں اور کفر کرتے ہیں اور یہ مصائب بھی واضح کئے گئے ہیں کہ موت کے بعد کی زندگی پر ان کا اطلاق ہوتا ہے یعنی مؤمنین کے لئے سکون و راحت اور منکرین کے لئے دوزخ کی آگ اور مصائب و آلام ہوں گے اور وہ ہمیشہ اسی کیفیت میں ہوں گے۔ مگر ہم اس دُنیا میں پیش آنے والے مصائب کو بھی خدا کی مشیت سے تعبیر کرتے ہیں اور بغیر کسی وجہ کے ان کو اِذنِ اللہ سمجھتے ہیں جو کہ غیر قرآنی تصور ہے قرآنی تصور تو یہ ہے کہ:

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ [11]

ترجمہ: اے انسان! تجھے جو بھی بھلائی حاصل ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے۔

اور ہدایت و گمراہی کے ضمن میں بھی واضح طور پر کہا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حق کو اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے پہنچا دیا ہے تو اب جو چاہے اسے قبول کرلے اور جو چاہے اپنی مرضی سے اسے رد کردے۔ سورۃ الکہف میں آیا ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [12]

ترجمہ: صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے۔

اس قسم کی واضح آیات کی موجودگی میں بھی اپنے بُرے اعمال کی وجہ سے آئے ہوئے مصائب کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے اور حق کو چھپانے اور ٹھکرانے کو بھی خدا کی مشیت اور نوشتۂ تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور قرآن حکیم کی بعض آیات کو حوالۂ متن سے ہٹ کر پیش کرکے اس غیر قرآنی تصور کو سہارا دینے کی کوشش بھی کی جاتی ہے اور نام دیا جاتا ہے نوشتۂ تقدیر کا۔ تقدیر کے اسی غیر قرآنی اور غیر اسلامی تصور کو علامہ اقبالؒ مسترد کرتا ہے اور صحیح قرآنی تصور پیش کرکے مسلمانوں میں ولولہ، جدوجہد اور حرکت و حرارت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوتھے نمبر پر پیش کئے گئے آیت، جس میں نصیب کا لفظ آیا ہے کا تناظر بھی وہی ہے کہ اس سے پہلی مذکورہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا کہ حق پر مبنی آیات کو جو لوگ اپنی مرضی سے جھٹلائیں گے اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو لوگ خود اپنی اصلاح کریں گے اُن کیلئے کوئی خوف و پریشانی نہیں ہے۔ یہی اُن کا نصیب ہے اور یہی اُن کا تقدیر جو اُن ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ مذکورہ آیت سے پہلے چند آیات کا ترجمہ پیش نظر ہے:

"اے بنی آدم! یاد رکھو اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویہ کی اصلاح کرلے گا۔ اس کیلئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو بالکل جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی سچی آیات کو جھٹلائیں۔ ایسے لوگ اپنے نوشتۂ تقدیر کے مطابق اپنا حصہ پاتے رہیں گے۔" [13]

آپ نے دیکھا کہ نوشتۂ تقدیر خود بنی آدم کے اپنے افعال و اعمال پر محضر ہے اور نصیب کا مطلب بھی نوشتۂ تقدیر نہیں بلکہ اپنے اعمال

کے نتیجے میں اپنا حصہ پانا ہے جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی جیسے اعمال ویسا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے حق اور واضح آیات کو جھٹلانے سے اُس کا نوشتۂ تقدیر دوزخ اور اسی حق کو ماننے اور اپنی اصلاح کرنے سے ہر قسم کے خوف و رنج سے چھٹکارا اِس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

چونکہ تقدیر کے اس جامد و غیر متحرک تصور سے علامہ اقبال کے نظریہ خودی کی نفی ہو جاتی ہے اور اُن کا نظریہ خودی بھی قرآنی تصور کے مطابق ہے لہٰذا اقبال نے بڑی شدت سے اس تصور کو رد کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نثری کتاب The Reconstruction of redeions thoughts in Islami جس کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کے نام سے کیا ہے، میں تقدیر کے قرآنی تصور، اور خودی کے بارے میں مغربی دانشور سپنگلر (Spengler) کے نظریات کا جاج لیتے ہوئے لکھا ہے:

" قرآن مجید نے بار بار تقدیر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا ہمیں تقدیر کے مسئلے پر بھی غور کر لینا چاہیے بالخصوص اس لئے کہ 'زوال مغرب' میں اشپینگلر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلام بھی خودی کی نفی کا خواہش مند ہے، حالانکہ تقدیر کے بارے میں قرآن مجید کا جو تصور ہے اس کی تشریح ہم اس سے پہلے کر آئے ہیں۔ پھر جیسا کہ اشپینگلر نے خود بھی لکھا ہے دنیا سے یگانگت پیدا کرنے کے دو ہی طریق ہیں، ایک عقلی دوسرا جس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا، اس لیے 'حیاتی'۔ عقلی طریق کے ماتحت تو ہم کائنات کا ادراک اس طرح کرتے ہیں کہ وہ علت و معلول کا ایک کڑا نظام ہے۔ حیاتی طریق کا تقاضا البتہ یہ ہے کہ بحیثیت ایک ایسے 'کل' کے جو زمانہ متسلسل کی تخلیق اس لیے کر رہا ہے کہ اپنے اندرونی تنوع کا اظہار کر سکے، ہم زندگی کو بطور ایک شے ناگزیر چپ چاپ قبول کر لیں۔ لیکن پھر کائنات کی طرف 'حیاتی' طریق ہی پر قدم بڑھانا وہ چیز ہے جسے قرآن پاک نے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا ایمان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم چند ایک قضیوں کو بے چون و چرا صحیح مان لیں۔ برعکس اس کے یہ تیقن اور اعتماد کی وہ کیفیت ہے جس کے لیے انسان کو بڑی نادر واردات اور تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور جس کی اہل صرف وہی شخصیتیں ہو سکتی ہیں جو نہایت درجہ مضبوط ہوں اور اس قسم کی تقدیر پرستی کو جو اس صورت میں ناگزیر ہے برداشت کرنے کی اہل "[14]

تقدیر کے اس جبری تصور کو اردو کے شاعر میر تقی میر نے تو محض شاعرانہ باریکیوں کے تناظر میں پیش کیا ہے کہ:

ناحق ہم مجبوروں پہ تہمت ہے مختاری کا

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا[15]

مگر ہم جانتے ہیں کہ علمی و فکری تناظر میں یہ تصور قرآنی تعلیمات کے بالکل منافی ہے اور علامہ اقبال نے اپنی نظم "تقدیر" میں مجبوری کے اس تصور کو شیطانی تصور قرار دیا ہے۔ وہ ابلیس و یزداں کا مکالمہ کرتے ہیں اور مختاری و مجبوری کا یہ تصور اس طرح پیش کترے ہیں۔

ہم نے دیکھ لیا کہ مجبوری کے اس تصور سے کتنی بیانک تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے مگر ہم پھر بھی اپنے آپ کو مجبور محض سمجھتے ہوئے کچھ بھی کر دیتے ہیں اور ذمہ داری اللہ تعالیٰ اور مشیت ایزدی پر ڈال دیتے ہیں۔ مجبوری کے اس گناؤنے سایہ میں ہم عموماً اپنے بُرے اعمال کو چھُپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن حکیم نے تو واضح کیا ہے کہ دین میں کسی قسم کا جبر نہیں مگر ہم پھر بھی قسم قسم کے تاویلات کرتے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم کا اِرشاد ہے:

لَاإِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدتَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِن بِاللهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَاانْفِصَامَ

لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔[16]

دین یازندگی کی کوئی بھی راہ وروش اختیار کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا(یعنی ایسا کرنے کی ہر انسان کو آزادی ہے)۔ فطری راہِ راست سے غیر فطری وٹیڑھی راہوں کو جُدا کرکے دکھایا گیاہے۔ چنانچہ جس کسی نے طاغوتی یا معاشرتی سرطانوں کے احکام تسلیم کرنے سے انکار کیا اور اللہ اور اس کے احکام کو دل وجان سے تسلیم کر لیا تو اُس نے (فرد ہو یا قوم) ایک مضبوط و ناقابلِ شکست دستہ تھام لیا۔ اللہ سب کچھ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔"[17]

لیکن اس کے باوجود جبر کے اس تصور کو بہت زیادہ پذیرائی ملی دراصل اس تصور کو عام کرنے کے لئے بہت بڑی قوتوں نے کام کیا ہے جس کی اپنی تاریخ ہے۔ جبر کا یہ تصور تاریخ اسلام میں خلافتِ راشدہ کے بعد ملوکیت کے دور میں عام ہوا تھا جس میں اموی اور عباسی حکمرانوں کی تحریک سرگرم عمل رہی ہے۔ نامور دانشور ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یہ پس منظر واضح کیا ہے:

''اِسلامی ادبیات میں جبر و قدر کا مسئلہ دَورِ ملوکیت میں داخل ہوا، اور اس کی نشرواشاعت کرنے والے فرعونی و ہامانی اور قارونی و آزری ادارے تھے۔ ان استحصالی۔ سرطانی اِداروں نے دستورِ ملوکیت کے مطابق رعایا کے حقوقِ انسانی سلب کر لیے تھے۔ اس کے نتیجے میں رعایا کے محنت کش طبقات بالخصوص ذلت و مسکنت، مفلوک الحالی محتاجی اور محکومی وغلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ ان مظلوموں کے ردِّعمل یا بغاوت کے خوف کے پیشِ نظر معاشرتی سرطانوں نے طاغوت یا اِبلیس کے نظریۂ جبر کی نشرواشاعت میں کوئی کسر اُٹھانہ رکھی! اور انہیں بُہت حد تک یہ باور کرانے میں کامیاب بھی ہوگئے کہ ان کی محرومی وزبوں حالی کے ذمے دار وہ نہیں بلکہ قسامِ ازل ہے، جس نے ان کی قسمت میں ہی بھُوک، ننگ اور تنگی زیست لکھ دی ہے۔ علاوہ بریں، انسان تو مجبور محض ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہ بھی ان کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں اسی کی مرضی سے کرتے ہیں، لہٰذا انہیں جو کُچھ لینا ہے، اللہ تعالیٰ سے مانگیں، ان سے نہ مانگیں۔ اس طاغوتی نظریے کو عقیدے کی صُورت میں مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ کرنے میں آزری پیشواؤں نے جلبِ منفعت اور ہوسِ منصب و اقتدار کی خاطر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ملوکیت کے ایماپر مسجدوں، مکتبوں، امراء کی مجلسوں اور درباروں میں اس مسئلے پر گفتگو کرنا فیشن بن گیا، اور مناظروں کا بازار بھی گرم ہوگیا۔ لیکن عقیدہ جبر کے مبلغوں کو چونکہ سرطانی اداروں کی سرپرستی حاصل تھی، اس لیے جیت ان باطل پرستوں ہی کی ہوتی تھی"۔[18]

علی عباس جلال پوری نے بہت جرآت وبے باکی کے ساتھ لکھاہے کہ:

''سلاطینِ بنو اُمیہ نے خلافت کو خاندانی میراث میں تبدیل کر دیا تھا جسے برقرار رکھنے کے لئے وہ جبر واستبداد سے کام لیتے تھے ان کی اکثریت لہو ولعب اور عیش کوشی کی دِلدادہ تھی جِس کے لوازم پر بیت المال کا روپیہ بیدردی سے خرچ کیا جاتا تھا۔ نتیجاً عہد جاہلیت کی قدروں نے از سرِنو قبول عام پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مورخ بنو اُمیہّ کے دورِ اقتدار کو بے دینی کے احیاٗ سے تعبیر کرتے ہیں۔ صلاح الدین خدا بخش جو بنو اُمیہ کے بڑے مداح ہیں ان کی بے دینی اور عیش پرستی کا اعتراف کرتے ہیں۔ عرب فطرتاً حریت پسند تھے اور جبر و استبداد کے عادی نہیں تھے۔ موالی الگ برافروختہ ہورہے تھے کیونکہ بنی اُمیہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ انقلابِ زمانہ کا کرشمہ تھا کہ وہی ایرانی جنہیں

عرب ابنأ(سلاطین زادے) کہا کرتے تھے اب ذِلت وزبوں حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ بنو اُمیہ ّنے قیاصرہ ٔروم کی طرح اپنے آپ کو عوام سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی اور ان کی تالیفِ قلب کی بجائے بزورِ شمشیر اپنا تسلط وتغلب منوانا چاہا۔ چنانچہ ان کے ایک صوبہ دار حجاج بن یوسف نے ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کا خون بہایا۔ قیدیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح باڑوں میں بند کرنا اور مردوں اور عورتوں کو اکٹھا زنجیروں میں جکڑنا اسی کی اولیّات ہیں۔ لیکن جبر وتشدد سے کسی زندہ قوم کے جذبہ حریت کو کچلا نہیں جاسکتا موالیوں نے جابجا بغاوتیں کیں اور ایرانیوں نے من حیث القوم علویوں اور عباسیوں کی دعوت کو تقویت دی۔ اِس سیاسی ردِ عمل کا ایک مذہبی اور داخلی پہلو بھی ہے جو ہمارے نقطہ ٔنظر سے زیادہ اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ ابن الوقت اور جاہ پسند علمأ کی ایک جماعت نے جسے بعد میں مُرجیہ کا نام دیا گیا حکومتِ وقت کا ساتھ دیا اور اس کے جورواستبداد کا جواز اس صورت میں پیش کیا کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اس لئے ظلم وستم اور جوروجفا کو صبر شکر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے"[19]

نامور ایرانی دانشور ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی نے اپنی معروف کتاب،فَاسئلوُ اِھل الذکر جس کا اردو ترجمہ نثار احمد زین پوری نے "اہل الذکر" کے نام سے کیا ہے، میں جبر واختیار کے اس تصور پر تبصرہ کیا ہے اور اپنے تبصرے کو اسی رائے پر منتج کیا ہے کہ جبر کا یہ خود ساختہ تصور اموی حکمرانوں کے خرافات میں سے ہے۔ چونکہ جبر کے اس نظریئے سے (معاذ اللہ) یہ تصور بھی سامنے آجاتا ہے کہ خدا اپنی مرضی سے ظلم بھی کرتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر تیجانی سماوی نے پہلے تو قرآن حکیم کی چند آیات کا حوالہ دیا ہے[20]، جس سے واضح ہوتا ہے کہ خدا ذرہ برابر بھی ظلم و ناانصافی نہیں کرتا۔ متعلقہ آیات معہ ترجمہ درج ذیل ہیں۔

اِنَّ اللہ لاَ یَظْلُمِ النأَّسَ شَیْئاً وَلکِنَ النَّاسَ أَنْفُسَہُم یَظْلِمُون[21]

ترجمہ: اللہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر کیا کرتے ہیں۔

اِنَّ اللہ لَاَ یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذرّۃ[22]۔ "خدا کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے"۔

وَلَاَ یَظْلِمُ رَبَّکَ أحَداً[23]۔ "اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا ہے"۔

وَمَا ظَلَمَھُمُ اللہِ ولکِنْ أَنْفَسَھُمْ یَظْلِمُون[24]۔ "اور خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں"۔

فَمَا کَانَ اللہُ لِیُظْلِمَھُمْ وَلکِنْ کَانُو أَنْفُسَھُمْ یِظْلِمُونْ۔[25]

ترجمہ: خدا کسی پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، لوگ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

وَمَاظَلَمْنَاھُمْ وَلکِنْ کَانُوھُمُ الظّٰالَمِیْن[26]۔ "اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا ہے یہ تو خود ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"۔

ذٰالِکَ بِمَا قَدّمَتْ أدِیکُمْ وأنَ اللہ لَیسَ بِظَلاَمٍ لِلْعَبِیْد۔[27]

ترجمہ: یہ اس لئے کہ تمہارے پچھلے اعمال کا نتیجہ یہی ہے اور خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنفْسِہِ ومن اَسَائَ فَعَلَیْھَا وَمَا رَبُکَ بِظَلاَمٍ لِلْعَبِیْد۔[28]

ترجمہ: جو بھی نیک عمل کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور جو برا کرے گا اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی ہوگا اور آپ کا پروردگار

بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

ان آیات کا حوالہ دینے کے بعد ڈاکٹر تیجانی اپنا تبصرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ: پس وہ مسلمان جو خدا اور اس کی عدالت و رحمت پر ایمان رکھتا ہے وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو پیدا کیا اور ان میں سے بعض کو جنت نشیں اور بعض کو جہنم مکیں بنا دیا۔ اور ان کے تمام اعمال کو معین کر دیا۔ پس ہر ایک شخص ان کاموں کے انجام دینے پر مجبور ہے۔ ان روایات کے لحاظ سے کہ جو قرآن کریم کے مخالف ہیں اور اس فطرت کے خلاف ہیں جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور عقل وجدان کے خلاف بھی ہیں اور انسانوں کے حقوق وسیع نہیں ہیں۔ ہم اس مذہب کو کیسے قبول کر لیں جو عقلوں کو اس بات میں محدود کرتا ہے کہ انسان خون کا لوتھڑا ہے جو قدرت کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہے۔ وہ جیسے چاہتی ہے نچاتی ہے تاکہ اس کے بعد اسے جہنم میں ڈال دے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو عقلوں کو خلق و ایجاد اور تعجب خیز اختراع و ارتقاء سے باز رکھتا ہے اور انسان بے حس و حرکت بن جاتا ہے اور اسی حالت پر برقرار رہتا ہے، جس میں ہے یا جو کچھ اس کے پاس ہے اس پر خوش رہتا ہے اس لئے کہ وہ مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ ہم ان روایات کو کیسے قبول کر لیں جو عقل سلیم کے خلاف ہیں، جو ہمارے لئے ایسا تصور پیش کرتی ہیں کہ خدا خالق جبار، قوی ہے اور اسے حق ہے کہ وہ اپنے کمزور بندوں کو اس لئے پیدا کرے کہ جہنم کی آگ میں جلایا جائے کسی جرم کی بنا پر نہیں کیونکہ اسے یہ بھی اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے، کیا عقلاً ایسے خدا کو رحیم، حکیم اور عادل کہتے ہیں؟ اگر ہم غیر مسلم علماء اور ذہین افراد سے گفتگو کریں اور اُنہیں یہ بتائیں کہ ہمارا پروردگار ان صفات کا حامل ہے، اور ہمارا دین لوگوں کی پیدائش سے قبل ہی ان کی شقاوت و سعادت کا فیصلہ کر دیتا ہے تو کیا وہ اسلام قبول کر لیں گے؟ اور گروہ گروہ دین میں داخل ہوں گے؟ پروردگار! تو پاک ہے یہ وہ خرافات ہیں جنہیں امویوں نے اپنے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے رواج دیا ہے۔[29]

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، علی عباس جلال پوری اور ڈاکٹر تیجانی ہی نہیں خود علامہ محمد اقبال نے بھی ان سب سے پہلے اپنے خطبات میں اسی رائے کا اظہار کیا ہے اور صاف لفظوں میں کہا ہے کہ:

"مگر پھر شاید آپ کہیں کہ عالم اسلام میں تو قرن ہا قرن سے جس نہایت درجہ ذلت خیز تقدیر پرستی کا دور دورہ رہا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ صحیح ہے، لیکن اس تقدیر پرستی کی ایک تاریخ ہے جس کی تشریح کیلئے دفتر چاہیے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ تقدیر پرستی جس کو مغربی مصنفین لفظ قسمت سے ادا کرتے ہیں۔ کچھ تو نتیجہ تھی بعض فلسفیانہ افکار اور کچھ سیاسی مصلحت پسندیوں کا۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کی وہ قوت جو اسلام نے مسلمانوں کے اندر پیدا کی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی اور آگے چل کر جب فلسفہ نے اس امر کی تحقیق میں کہ لفظ علت کا اطلاق اگر ذات ایزدی پر کیا گیا تو اس کے معنی کیا ہوں گے، علیٰ ھٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ علت و معلول کو آپس میں جو نسبت ہے زمانہ اس کی شرط ضروری ہے، ایک ایسے خدا کا تصور قائم کیا جو موجودات عالم سے وراء الورا، قدیم ہی سے موجود اور اس لیے خارج سے اس پر عمل کر رہا ہے۔ لہٰذا کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چونکہ بالآخر ذات خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ دوسری جانب دمشق کے موقع شناس اموی فرمانرواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال دیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں

اور انہیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔ چنانچہ کہاجاتاہے جب معبد نے حسن بصری سے کہااموی مسلمانوں کو قتل کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یونہی تھی تو حسن بصری نے کہا'یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں' یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر علمائے اسلام کے کھلم کھلا احتجاج کے باوجود عالم اسلام نے ایک بڑی ذلت خیز تقدیر پرستی اختیار کرلی"۔[30]

آپ نے دیکھا کہ نظریہ جبر کس ضرورت کے تحت گھڑھا گیاہے اور ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ اسی نظرئے کو زیادہ مقبولیت حاصل رہی ہے بلکہ عمومی طور پر جب بھی زندگی میں کسی کو کوئی نقصان اُٹھاناپڑتی ہے تو بجائے اس کے کہ نقصان اُٹھانے میں اپنی کوتاہیوں پر نظر ثانی کریں، کہاجاتاہے کہ یہی خدا کو منظور تھااور یہی نوشتۂ تقدیر تھا۔ اگر یہی نوشتۂ تقدیر ہے اور واقعی سب کچھ اللہ کی مشیت ہی سے بلا کسی حجت کے ہوکے رہے گا تو پھر خدا کا قانون، مکافاتِ عمل یوم الحساب، میزان، اور انسان سے سوال جواب کرنے کا مقصد کیاہے؟ انسان کو باشعور، صاحب عقل اور صاحب اختیار و ارادہ کیوں بنایا گیا؟ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کو کس مقصد کے لئے نازل کیا؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کے جوابات جبری عقائد کے حامل علماء اور لوگوں کو دینے پڑیں گے۔ کیونکہ ایسے عقائد کے ماننے سے تو اللہ تعالیٰ کا سارانظام متزلزل ہوجاتاہے۔

قرآن حکیم میں جہاں جہاں لفظ قدر، تقدیر، مقدر وغیرہ آیاہے تو وہاں عموماً چاند سورج ستاروں، افلاک، زمین اور دیگر نباتات و جمادات کے ساتھ آیاہے جس سے مراد مقدار ہے۔ نہ کہ نوشتۂ تقدیر۔ اگر انسان سے تقدیر و مقدر کا کوئی واسطہ ہے تو وہ بھی قرآنی تصور کے مطابق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کیلئے پیدائش و موت مقرر کی ہے۔ یعنی پیدائش کے بعد ہر انسان کو یقینا مرنا ہی ہے۔ انسان ہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین میں ایک مقدار کے مطابق وسائل پیدا کئے ہیں اور ان سب چیزوں کے معین مقدار میں پیدا کرنے کے بعد انسان میں بدی و نیکی دونوں کی صلاحیتیں رکھ دیں تاکہ وہ اپنی مرضی اور اپنے عقل و خرد کے مطابق ان قدرتی وسائل سے مستفید ہوں۔ اب اگر انسان بدی کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر وسائل پر قابض ہوتاہے تو اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہے اور اگر نیکی کی صلاحیتوں کو استعمال میں لاتاہے تو بھی اس کو اس کا صلہ ملے گا۔ قدر و تقدیر کے الفاظ کس طرح قرآن حکیم نے استعمال کئے ہیں چند مثالیں پیش نظر ہیں۔

ذَالِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزُ الْعَلِيمِ۔[31]

ترجمہ: یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔

اسی آیت سے پہلے دن رات اور سورج کے حساب کا تذکرہ ہے۔ مکمل دو آیات کا ترجمہ یوں ہے:"ان کے لئے ایک اور نشانی رات ہے ہم اُس کے اوپر سے دن ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا جاتاہے اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہاہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے"[32]۔

وَ خَلَقَ كُلَّ شَئٍ فَقَدَّرَہ تَقْدِيْراً[33]

ترجمہ: جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔

ہر چیز کا پیدا کرنا اور اس کی تقدیر مقرر کرنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کی حدیں متعین کیں اور یہ اس لئے کہ عقل و خرد سے عاری تخلیقات کی حدیں اللہ تعالیٰ ہی مقرر کرتاہے حتیٰ کہ انسانوں میں بھی جو افعال اُن کے عقل و خرد اور اختیار و ارادہ سے تعلق نہیں رکھتے اُن

کی حدیں بھی اللہ تعالیٰ ہی متعین فرماتا ہے جیسا کہ پیدائش و موت، وسائل کا پیدا کرنا وغیرہ لیکن ان وسائل کا استعمال انسان اپنے ہی ارادے اور اختیار سے کرتا ہے چاہے وہ درست طریقہ سے کرے یا غلط۔ سورہ عَبَسَ کی چند آیات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ سورۃ عَبَسَ کی چند آیات کا ترجمہ ہے "لعنت ہو انسان پر کیسا سخت منکر حق ہے یہ کِس چیز سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے نطفہ کی بُوند سے پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ پھر اس کے لئے زندگی کی راہ آسان کی پھر اسے موت دی۔ پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اُٹھا کھڑا کرے گا۔ ہرگز نہیں! اُس نے وہ فرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا۔ پھر ذرا انسان اپنی خوراک کو دیکھے ہم نے خوب پانی لُنڈھایا۔ پھر زمین کو عجیب طرح چھاڑا۔ پھر اُس کے اندر اُگائے غلے۔ اور انگور اور ترکاریاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور طرح طرح کے پھل اور چارے تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامانِ زیست کے طور پر"[34]

اس ترجمہ میں آپ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اُن چیزوں کی تقدیر مقرر کی ہے جو عقل وارادہ سے عاری ہیں اور انسان کیلئے بھی محض پیدائش، موت اور دوبارہ زندگی کی تقدیر اللہ تعالیٰ نے خود متعین کی ہے مگر انسان کو جو فرض دیا گیا ہے اُس کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا اختیار انسان ہی کو دیا ہے۔ گویا اچھے اور بُرے اعمال کا ذمہ دار انسان ہی ہے اور مقررہ حدیں نباتات و جمادات کیلئے ہی ہیں۔

چونکہ قرآن حکیم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس وقت تک کسی قوم کی تقدیر نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔ لہٰذا بہت واضح ہے کہ تقدیر ایک ہی نہیں ہوتی۔ تقدیریں کئی ہوتی ہیں جو انسانوں اور اقوام کے افعال، اعمال، تحرک اور چاہت کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ یہی قرآنی تصور ہے کہ جس کی رہنمائی قرآنی آیات سے ملتی ہے لہٰذا خلاصہ اور نتیجہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فلسفہ جبر و قدر کو سمجھنے کا بنیادی ماخذ قرآن حکیم ہی ہے اور اس بنیادی ماخذ سے اتنی واضح رہنمائی ملتی ہے جس کی موجودگی میں کسی فلسفی، یا کسی فلسفیانہ مکتب فکر کی رہنمائی کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ حتیٰ کہ اس پس منظر میں مختلف مکاتیب فکر میں سے معتزلہ، جبریہ، قدریہ وغیرہ کے پیروکاروں سے بھی رہنمائی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ قرآن حکیم کی ایات پر غور وخوض کے بعد بات واضح ہو جاتی ہے کہ جبر و قدر کے فلسفہ کو پیچیدہ بنانے کی بجائے صاف نیت سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کوشش کے نتیجے میں قرآن حکیم سے یہی رہنمائی ملتی ہے کہ انسان اپنے افعال و اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اپنے فکر وارادہ میں مکمل طور پر آزاد اور صاحب اختیار ہے۔

حوالہ جات

[1] عمران الدین، محمد، پرویز، سرسید احمد خان کا نیا مذہبی طرز فکر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور 2013ء، ص۔ 49-50

[2] ناصر، نصیر احمد، سرگذشت فلسفہ (حصہ اول)، فیروز سنز، کراچی 1991ء، ص 444

[3] اقبال، کلیات اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت ہشتم جنوری 1989ء، ص۔ 526

[4] قرآن حکیم۔ سورۃ ابراہیم۔ 17، آیت۔ 4، تفہیم القرآن (ابوالاعلیٰ مودودی)، جلد دوم، ترجمان القرآن لاہور، 1984ء، ص۔ 471

[5] قرآن حکیم، سورۃ الحدید۔ 57، آیت۔ 22، تفہیم القرآن، جلد۔ 5، ترجمان القرآن لاہور، 1983ء، ص۔ 519

[6] قرآن حکیم، سورۃ التغابن، آیت۔ 11، تفہیم القرآن، (جلد۔ 5)، ص۔ 541

[7] قرآن حکیم، سورۃالاعراف۔7، آیت۔27، تفہیم القرآن،(جلد۔2)،1984ء، ص۔25

[8] قرآن حکیم، سورۃابراہیم۔17، آیت۔4،(محولہ بالا)

[9] قرآن حکیم، سورۃالصف۔61، آیت۔5، تفہیم القرآن،(جلد۔5)، ص۔457

[10] قرآن حکیم، سورۃالحدید۔57، آیات۔22تا25، تفہیم القرآن جلد۔5، ص۔319تا321

[11] قرآن حکیم، سورۃاللنساء۔4، آیت۔79، تفہیم القرآن جلد۔1، ترجمان القرآن لاہور، 1983، ص۔375

[12] قرآن حکیم، سورۃالکہف۔18، آیت۔29، تفہیم القرآن جلد۔3، ترجمان القرآن لاہور، 1981، ص۔23

[13] قرآن حکیم، سورۃالاعراف۔7، آیت۔36-35، تفہیم القرآن،(جلد۔2)،1984ء، ص۔25

[14] اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (مترجمہ سید نذیر نیازی) بزم اقبال کلب روڈلاہور، طبع دوم، مئی1983ء، ص۔166-165

[15] میر تقی میر، انتخاب کلام میر (مولفہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق)، لاہور اکیڈمی لاہور، (س۔ن) ص۔54

[16] قرآن حکیم، سورۃ البقرۃ256:2

[17] قرآن حکیم کی آیات اور اردو ترجمہ، بحوالہ سرگذشت فلسفہ جلد اول (از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر) فیر زسنز لاہور، بار اول 1991، ص۔443

[18] ناصر، نصیر احمد، ڈاکٹر، سرگذشت فلفسہ (جلد اول)، ص۔446-445

[19] جلال پوری، علی عباس، اقبال کا علم الکلام، تخلیقات لاہور، بار دوم، مارچ1999ء، ص۔31-30

[20] سماوی، محمد تیجانی، ڈاکٹر، اہل الذکر (مترجمہ نثار احمد زین پوری، انتشارات انصاریان قم ایران، اشاعت سوم، 1375ش/1417ھ، ص46-44

[21] یونس۔44

[22] قرآن حکیم، سورۃالنساء40:4

[23] قرآن حکیم، سورۃ کہف۔49

[24] قرآن حکیم، سورۃ آل عمران117:3

[25] قرآن حکیم، سورۃ توبہ۔70، عنکبوت۔40، روم۔9

[26] قرآن حکیم، سورۃ زخرف۔76

[27] قرآن حکیم، سورۃانفال۔51

[28] قرآن حکیم، سورۃ فصلت۔46

[29] سماوی، محمد تیجانی، ڈاکٹر، اہل الذکر (مترجمہ نثار احمد زین پوری، انتشارات انصاریان قم ایران، اشاعت سوم، 1375ش/1417ھ، ص47-46

[30] اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص۔168-167

[31] قرآن حکیم، سورۃیٰسین۔36، آیت۔38، تفہیم القرآن جلد۔4، ترجمان القرآن لاہور، 1983ء، ص۔259

[32] قرآن حکیم، سورۃیٰسین، آیات۔166-165، تفہیم القرآن جلد۔4، ترجمان القرآن لاہور، 1983ء، ص۔259

[33] قرآن حکیم، سورۃالفرقان25، آیت۔2، تفہیم القرآن جلد۔3، 1981ء، ص۔433

[34] قرآن حکیم، سورۃعَبَسَ۔80، آیات۔32-17، تفہیم القرآن جلد۔6، ص۔258-256